Fikr-o-Nasar (Islamabad) 30:4 (1993)

اسلامی ثقافت میں جمود کے اسباب

ڈاکٹر فؤاد سیزگین
ترجمہ: ڈاکٹر خورشید رضوی

گزشتہ چند برسوں کے دوران جب مجھے عرب ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے کا اتفاق ہوا جو بحیثیت مجموعی تاریخ علوم یا علوم کے کسی خاص شعبے میں مسلمانوں کے مقام سے متعلق تھے تو تقریباً ہر مرتبہ یہ سوال مجھ سے پوچھا جاتا رہا کہ وہ اسباب کیا تھے جو اسلامی ثقافت میں جمود کا باعث بنے۔

یہی سوال گاہے گاہے براہ راست یا گھما پھرا کر مجھ سے بہت سے اور لوگوں نے بھی پوچھا جن کے دلوں میں بہت سے شکوک تھے، خصوصاً علم و ثقافت کی تاریخ میں مسلمانوں کے حصے کے بارے میں۔ ان کا یہ متشککانہ موقف سوال کی ساخت ہی سے ظاہر تھا۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ اگر واقعی بقول آپ کے مسلمانوں کو علم و تمدن کی تاریخ میں ایسا اونچا مرتبہ حاصل تھا تو پھر آج مسلمان معاشرے کی اس درجہ پس ماندگی کا کیا سبب ہے۔

اس تشکک اور قنوطی نقطہ نظر کی اساس یہ ہے کہ بعض لوگوں کو بالواسطہ یا بلا واسطہ مغربی معاشرہ سے متعارف ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے دور حاضر میں اس زبردست فرق کا مشاہدہ کیا جو مغربی معاشرے اور اسلامی معاشرے کی علمی اور تکنیکی سطح کے مابین پایا جاتا ہے۔

بعض اوقات یہ سوال ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے جو اپنے علمی و دینی ورثے پر مضبوطی سے قائم ہیں اور انہیں اپنی ثقافت میں جمود کو دیکھ کر نیز مغربی معاشرے کے مقابلے میں اپنی موجودہ پس ماندگی کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ پہلے گروہ میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو علوم

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

عقلیہ کی نجات دہندہ و شفا بخش قوت پر ایمان مطلق رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو معاشرے میں ایمان اور عبادت کے کسی حد تک موجود رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے جبکہ کچھ وہ ہیں جن کے خیال میں معاشرے کا معیار بلند کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اسے دین اور عقیدے سے یکسر پاک کر دیا جائے' ہر ایسے ثقافتی و تمدنی عنصر کو ترک کر دیا جائے جس کا دین اور عقیدے سے کچھ ربط ہو اور تمام تر توجہ مغربی دنیا کی طرف دی جائے۔ اس قسم کی فکری رو نے بیسویں صدی کے آغاز سے بعض اسلامی ممالک میں رنگ پکڑنا شروع کیا اور میرے وطن [ترکی] پر بطور خاص تسلط جما لیا۔ چنانچہ حکام نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور یہ سمجھنے لگے کہ انہوں نے ایک نئے معاشرے کی تخلیق کے لئے صحیح بنیادی علاج اور اکسیر اعظم کو دریافت کر لیا ہے۔ اب اس علاج کا تجربہ ہوئے ایک صدی ہونے کو آتی ہے اور معالجوں کی اکثریت کو اس کی صحت اور تاثیر پر شک گزرنے لگا ہے۔ چنانچہ اب وہ کوئی اور راستہ تلاش کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ مایوسی و ناکامی بہت سے لوگوں کے ہاں ایک نفسیاتی گرہ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ جس تازہ ترین تجربے کو انہوں نے قبول کیا اور سینے سے لگایا تھا اب اس سے نفور ہیں بلکہ بسا اوقات اس کے خلاف انتقامی جذبات رکھتے ہیں۔ کچھ اور اسباب ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اشتراکیت کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ آخری نجات دہندہ کی حیثیت سے دست شفقت بڑھانے میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ اس گروہ کے لوگوں کی نظر میں اسلامی معاشرے کی پس ماندگی کا صرف ایک ہی سبب ہے اور وہ' ماضی و حال میں' خود "اسلام" ہے۔ یہ ایک طرف کی بات تھی ۔ دوسری طرف روایت پسندوں کی رائے میں معاشرے کی پس ماندگی اور اسلامی ثقافت میں جمود کا سبب دینی تعلیمات سے وابستگی میں کمزوری اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں اس کے کامل نفاذ میں کوتاہی ہے۔

ان دونوں فریقوں کے بیچ میں بہت سے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دونوں توجیہوں سے دامن کش ہیں اور حیرت کا شکار ہیں۔ بسا اوقات وہ ان سہل انگاروں کے ہمنوا ہو جاتے ہیں جو معاشرے کے جمود کو اسلامی سوسائٹی کے کسی خاص ادارے کی سستی یا بگاڑ کا یا کسی غیر مسلم عنصر کی دخل اندازی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگ مجھ سے میرے ذاتی جواب یا میری خاص توجیہ کی توقع

رکھتے ہیں جیسا کہ میرے خطبے کے عنوان کا تقاضا ہے۔ میں آپ کے سامنے اعتراف کرنا چاہوں گا کہ یہی سوال جب گزشتہ خطبات کے دوران میرے سامنے پیش کیا جاتا تھا تو میں اس سے دامن بچانے کی کوشش کرتا تھا اور یہ عذر پیش کرتا تھا کہ اس کے جواب کے لئے بہت وقت درکار ہوگا اور یہ وعدہ کیا کرتا تھا کہ انشاء اللہ جلد از جلد اس ذمہ داری کو بھی ادا کروں گا۔

سامعین کرام! اپنی گفتگو کے آغاز ہی میں' میں آپ تک یہ درخواست پہنچا دینا چاہوں گا کہ آپ مجھ سے اس مسئلے کے حتمی حل' یا کسی ایسے حل کی توقع نہ رکھیں جو قریب قریب حتمی کہلا سکے۔ میری جانب سے آپ کے سامنے اس مسئلے کا جائزہ محض اس مورخ کی کوشش ہے جسے تاریخ علوم کے ضمن میں تیس برس سے زائد عرصے تک عربی و اسلامی ورثے کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور جو یہ چاہتا ہے کہ موجودہ صدی میں اس مسئلے پر مختلف بحثوں سے واقفیت بہم پہنچانے کے بعد' ان علوم سے خاص اپنے تعلق کی روشنی میں اس مسئلے پر بحث کرے جس کی اساس اس اصول پر قائم ہو کہ درست توجیہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عربی و اسلامی علوم کی ایک ہمہ پہلو اور ٹھیک ٹھیک تصویر سامنے نہ آجائے جس سے ہمیں پوری وضاحت سے ان عناصر کا علم ہو جائے جنھوں نے ان علوم کی تشکیل و تکوین کی اور جو غالباً کسی خاص وقت میں کمزور اور مضمحل ہونے لگے۔ اسی طرح ان تخریبی اور رجعت پسند عناصر کا بھی علم ہو جائے۔ جنھوں نے مرور زمانہ کے ساتھ اسلامی معاشرے کے ارتقاء کی رفتار کو سست کرنے اور بالآخر اسے جمود کی کیفیت تک پہنچانے میں حصہ لیا۔

اس مسئلے پر بحث نئی نہیں ہے۔ مسلمان اور مستشرقین اس پر غور کر چکے ہیں اور دوسری عالمی جنگ کے بعد سے اس پر خصوصی توجہ میں اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں فرانکفرٹ میں " روایتی سانچوں کی تقلید اور ثقافتی زوال کا مسئلہ"(Klassizismus und Kulturver fall) کے موضوع پر ایک علمی کانفرنس منعقد ہوئی اور بارہ علماء نے مختلف تہذیبوں کے حوالے سے اس موضوع پر بحث کی جن میں اسلامی تہذیب بھی شامل تھی۔ اس کانفرنس کے چند ماہ بعد فرانس کے شہر Bor deaux میں ایک اور کانفرنس ہوئی جو بطور خاص اس موضوع پر اسلامی تہذیب ہی کے حوالے سے بحث کے لئے " تاریخ اسلام میں روایتی سانچوں کی تقلید اور ثقافتی زوال" (۱) کے نام سے منعقد کی گئی۔

اس مسئلے پر بحث میں انیس علماء نے مقالات پیش کر کے حصہ لیا۔ ہر ایک نے اسلامی تہذیب یا علوم کے کسی ایک معین پہلو سے بحث کرنے اور جمود کے جو اسباب و مراحل اس کی نظر میں آ سکے ان کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ دینی افکار' اسلامی فقہ' اسلامی فنون' تصوف' فلسفہ اور عقیدہ' عربی ادب اور علوم طبیعیہ کو بھی اسی طرح زیر غور لایا گیا۔ ان علماء میں سے کسی نے بھی یہ دعوی نہیں کیا کہ اس کی توجیہ حتمی ہے۔ یہ قیمتی مشاہدات اور اہم آراء اسلامی علوم و تہذیب کے مختلف گوشوں میں ان کے طویل انہماک کا ثمرہ ہیں۔ مسلمان قاری کو چاہئے کہ وہ ان کا مطالعہ اور ان سے استفادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان کو کلی یا جزئی طور پر قبول کرنے کا پابند نہیں اور نہ اسے یہ توقع رکھنی چاہئے کہ یہ سب آراء جو پیش کی گئیں درست بھی ہوں یا اسلامی تہذیب سے رشتہ رکھنے والوں کے احساسات سے کاملاً ہم آہنگ ہوں۔

یہاں میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ ان سب اہل علم کے افکار کا خلاصہ بیان کر سکوں۔ نہ میں ان افکار کی صحت پر تفصیل سے بحث کر سکوں گا۔ البتہ دو باتوں کی طرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ اس مسئلے پر عمومی بحث کے ضمن میں ایک اہم حقیقت ان علماء کی پیش کردہ علمی آراء میں بھی ہمیں نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ عموماً اسباب اور علامات آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس مسئلے کو زیر بحث لاتے ہوئے عمومی اعتبار سے اس فرق کو امتیازی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ امر واضح ہوتا ہے کہ جس چیز کو محقق اسلامی تہذیب کے جمود کا سبب تصور کر رہا ہے' بنگاہ غائر دیکھا جائے تو' وہ حقیقت میں "سبب" نہیں بلکہ علامات میں سے ایک علامت ہے۔

دوسرے یہ کہ علوم کی عمومی تاریخ میں ہنوز عربی و اسلامی علوم کے مقام کی شناخت یا وضاحت نہیں کی جا سکی۔ ہرچند کہ مستشرقین نے علوم کے مختلف میدانوں میں مسلمانوں کے بہت سے اہم کارناموں کا سراغ لگا لیا ہے تاہم دو تین سو برس سے مؤرخین علوم کے ہاں پیشکش کا جو قدیم روایتی انداز ورثے میں چلا آ رہا ہے وہ قریب قریب جوں کا توں باقی ہے۔ اسی طرح کسی ایک میدان کے بجائے مجموعی اعتبار سے تاریخ علوم میں مسلمانوں کے مقام کا کوئی ٹھیک ٹھیک اور بھرپور تصور ہنوز تشکیل نہیں پا سکا۔ اس صورت حال کے نتیجے میں مسلمانوں کے مقام

کا موازنہ دیگر اقوام ـــ خصوصاً اہل یونان ـــ کی علمی عطا یا تمدن سے کرنا مناسب نہ ہو گا۔ وہ اس لئے کہ یونانی ورثہ تاریخ علوم میں اس وقت آیا جب اس کے پسند کرنے والوں نے پہلے اسے اپنے ذوق کے مطابق خوب جانچ لیا اور اسے اچھی طرح صیقل اور مرتب کر لیا گیا۔ اور معیاری مواد کو غیر معیاری مواد میں سے چھانٹ لیا گیا۔ چنانچہ کہاں کمزوری ہے اور کہاں مضبوطی نیز کیا عناصر تعمیری ہیں اور کیا تخریبی' اس ضمن میں اسلامی علوم میں اختصاص رکھنے والوں کے تبصرے بیشتر درست یا صائب نہیں ہوتے۔ اس موقع پر میں چاہوں گا کہ اسلامی ثقافت میں جمود کے مسئلے پر ایک توجیہ آپ کے سامنے رکھوں جسے عظیم مستشرق ہلموت ریٹر (Hellmut Ritter) نے بیان کیا ہے۔

وہ سوال اٹھاتا ہے کہ "مسلمان عالم کے ذمے کیا کام ہے؟ یہ کہ جو کچھ اس کے اساتذہ نے اسے سکھایا پوری پوری صحت و دیانت کے ساتھ آئندہ نسل تک منتقل کر دے۔ اور ہمارے ہاں کیا چیز پیش نظر ہے؟ ایک کلیہ آداب [College of Arts] کی مجلس اساتذہ نے جب فلسفے کی کرسی کے لئے ایک امیدوار کا انتخاب کرنا چاہا تو یوں ہوا کہ اس مجلس نے ایک مشہور جرمن فلسفی کے ایک شاگرد کو امیدوار قرار دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اپنے استاد کے مقابلے میں اس شاگرد نے فلسفے کے میدان میں کوئی نئی چیز پیش نہیں کی کیونکہ وہ بہر صورت کسی ایسے رفیق کار کی تلاش میں تھے جس نے کوئی نئی' انوکھی بات پیدا کی ہو۔ کالج کا یہ موقف ایک بنیادی خیال پر منحصر تھا۔ اور وہ یہ کہ کوئی آخری اور طے شدہ حقیقت وجود نہیں رکھتی۔ رہا اس امکان کا گمان کہ فلاں فلسفی آخری حقیقت تک پہنچ گیا ہے سو یہ ان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ دور جدید کے لئے حقیقت کا مفہوم بنیادی طور پر ارتقائی ہے جو مسلسل' معلوم سے بلند تر کی طرف سفر کرتا رہتا ہے جبکہ اس کا مفہوم اسلامی اور تھوڈوکسی (مراد عقیدہ اہل سنت) میں ایک حتمی اور مستقل شے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب میں مسلسل ایک ذہنی غلغلہ برپا رہتا ہے جبکہ مشرق پر وہی جانی پہچانی آسودگی چھائی رہتی ہے جو اس کا امتیاز ہے اور جس کا اشتیاق گاھے گاھے گوئٹے نے ظاہر کیا۔ مشرقی ذہنیت میں " تبدیل نہ ہونے" کی کیفیت ہمیں جمود نظر آتی ہے جبکہ مسلمانوں کے مسلمہ عقائد میں نئی نئی باتوں کو بدعت تصور کیا جاتا ہے جن کی حقیقت مشکوک اور مشتبہ ہے۔ ان کے ہاں ہر وہ عہد روبہ زوال ہے جو قدیم مثالی معیار سے ہٹ گیا ہو جبکہ ہم کسی

عہد کو اس لئے روبہ زوال تصور کرتے ہیں کہ اس میں کوئی تغیر ہی پیدا نہیں ہوا۔"

یہ چند تاثرات ایک عظیم جرمن فاضل کے ہیں جسے عربی و اسلامی ورثے کے ایک بڑے حصے سے واقفیت حاصل تھی' اس نے دوسروں کو اس سے متعارف کرانے میں بڑا حصہ لیا اور اس کے دل میں اس ورثے کے لئے محبت اور احترام کے جذبات پائے جاتے تھے۔ میں' جو اس فاضل کا شاگرد اور اس کا بے حد رہین احسان ہوں' اگر یہ کہوں تو غالباً کسی گستاخی کا مرتکب نہ ہوں گا کہ میرے خیال میں ادب و بلاغت کے موضوع پر عرب علماء کے نہایت اہم کارناموں کا سراغ لگانے والے میرے اس استاد کی مجموعی عربی و اسلامی ورثے پر بھرپور نظر نہیں تھی اور میرے خیال میں وہ سوانحی تحریروں میں وارد ہونے والے نوادر اور قصے کہانیوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے اسلامی تمدن میں جمود کے مسئلے کو پیش کرتے ہوئے ایسے نتائج اخذ کئے ہیں جو ان معلومات سے ہم آہنگی نہیں رکھتے جن کا انکشاف مسلمان علماء کے عمومی موقف' تاریخ علوم میں تازہ کاری کے سلسلے میں ان کے یقین اور صلاحیت' نیز عقل انسانی کی قدرت پر ان کے اعتماد کے سلسلے میں اب تک ہو سکا ہے۔ اتفاق سے مجھے اپنے منصف مزاج استاد کے ان تاثرات پر -- بعض مثالوں کی مدد سے جو آگے آئیں گی -- اعتراض پیش کرنے کا موقع بھی ملا۔ اس کے جواب میں جو کچھ انہوں نے کہا وہ یہ تھا" استغفراللہ' میرے ذہن میں جو کچھ آیا میں اس کی خوبی و صحت کے غرے میں رہا حالانکہ اس کی بنیاد محض نفس امارہ پر تھی"۔ میں نے ان کی خدمت میں دوسری صدی ہجری کے جابر بن حیان کے بعض اقوال پیش کئے جو علم بشری کے حدود پر اس کے اصولی موقف سے متعلق تھی۔ جابر بن حیان کی رائے یہ تھی کہ علم میں اضافے نیز نئے انکشافات کے سلسلے میں انسان کے سامنے کوئی حد نہیں ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ تمام کائنات کے اسرار منکشف کرنے کی کوشش کرے اور یہ کہ اس عالم سے ماوراء و اسرار ہیں ان سب کو منکشف کرنے کی صلاحیت اسے عطا کی گئی ہے۔ یاد رہے کہ ارسطو بنی نوع انسان میں ایسی صلاحیت کا انکار کرتا ہے۔

جابر کو شاید اوروں سے بڑھ کر اس بات کا یقین تھا کہ ہماری دنیا مادی اور روحانی دونوں اعتبار سے ایک ہمہ گیر ریاضیاتی قانون پر قائم ہے۔ اسے یقین تھا کہ تمام موجودات عالم اور ان کے عمل عددی قیاس میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ : اگر ہم خواص اشیاء کی عددی

تعلیل مہیا کر سکیں تو ہم دنیائے کیمیا میں اپنے کام کو صحیح بنیاد فراہم کر دیں گے اور اسی بنیاد پر اشیاء کو قیاس کرنے کا اصول یعنی اشیائے عالم کے لئے ریاضیاتی حتمیت کے میزان کا اصول قائم ہو گا۔ یہ اصول اشیاء اور ان کی داخلی ہم آہنگی کے ایک معقول نظام کی وضاحت کرتا ہے اور ایک اعتبار سے ہر شے میں اس کا ظہور بھی موجود ہے جبکہ دوسرے اعتبار سے یہی دنیا کا مجرد اساسی مفہوم بھی ہے۔ ۰۰۰وغیرہ وغیرہ"

میں نے ان کو (یعنی اپنے استاد کو) ابن الھیثم کی کتاب "فی الشکوک علی بطلیموس" کے پیش لفظ میں سے اس کا یہ قول سنایا:

" حق مقصود بالذات ہے۔ اور جو چیز مقصود بالذات ہو اس کے طالب کو صرف اسی کے پانے سے غرض ہوتی ہے۔اور حق کو پانا دشوار ہے اور وہ راستہ جو اس کی طرف جاتا ہے دشوار گزار ہے۔ حقائق،شبہات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ علماء سے حسن ظن رکھنا سب لوگوں کے خمیر میں ہے۔ چنانچہ علماء کی کتابوں کا قاری اگر اپنی طبیعت کے تقاضے کو راہ دے دے اور اپنا مقصد یہی بنا لے کہ ان کے فرمودات کی حقیقت اور ارشادات کی غایت کو سمجھ سکے تو اس کو جو حقائق حاصل ہوں گے وہ محض ان معانی اور مقاصد سے عبارت ہوں گے جو ان علماء نے مراد لئے اور جن کی طرف انہوں نے اشارہ کیا۔ حالانکہ اللہ نے علماء کو معصوم عن الخطا نہیں بنایا اور نہ ان کے علم کو تقصیر و خلل سے محفوظ بنایا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی علمی مسئلے پر علماء میں باہمی اختلاف نہ ہوتا اور نہ حقائق میں کسی شے پر ان کی آراء متفرق ہوتیں جبکہ امر واقع اس کے برخلاف ہے۔ لہٰذا طالب حق وہ نہیں جو متقدمین کی کتابوں کا محض قاری ہو اور ان پر حسن ظن میں اپنے طبعی رجحانات کے ساتھ بہہ جائے بلکہ طالب حق وہ ہے جو ان کے بارے میں اپنے ظن پر بھی شک کرے۔ ان کی کتابوں سے جو کچھ سمجھے اسے تامل کے بعد قبول کرے۔ دلیل و برھان کی پیروی کرے محض قول قائل پر نہ چلے جو خود ایک انسان ہے۔ اور جس کی سرشت کی خصوصیت ہے کہ اس میں طرح طرح کے نقص و خلل شامل ہیں۔ اگر کتب علوم کے کسی قاری کا مقصد حقائق کی پہچان ہو تو اس کو لازم ہے کہ جو کچھ پڑھے اس پر مخالفانہ نظر ڈالے اور اس کے متن و حواشی سب کے بارے میں ذاتی طور

پر ذہن دوڑائے اور ہر ہر پہلو سے اس پر کڑی تنقید کرے اور اس تنقید کے عمل میں خود اپنی ذات کو بھی شک و شبہ سے بالا تر نہ سمجھے ۔ چنانچہ مخالفت یا موافقت میں توازن کو بگڑنے نہ دے ۔ اگر وہ اس روش کو اختیار کر سکے تو حقائق اس پر منکشف ہو سکیں گے اور متقدمین کے ہاں جو امکانی کوتاہی یا اشتباہ رہ گیا ہو گا اسے نظر آ جائے گا"۔ (۲) ۔

"القانون المسعودی" کے مقدمے میں البیرونی کا یہ قول بھی میں نے استاد محترم کو سنایا:

"میں نے وہی کیا ہے جو ہر انسان کو اپنے فن میں کرنا لازم ہے یعنی اگلوں کے اجتہاد کو ممنونیت کے ساتھ قبول کرے اور اگر کہیں خلل پائے تو بے جھجک اس کی اصلاح کر دے ۔ اور جو کچھ اس فن میں خود اسے سوجھے اسے اپنے بعد کے زمانے میں آنے والوں کے لئے محفوظ کر جائے" (۳)

ہو سکتا ہے آپ میں سے بعض کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اسلامی فکر کی تاریخ میں اس نوع کے افکار اور ایسے افکار رکھنے والے لوگوں کا وجود ایک نادر سی چیز رہی ہو گی ۔ چنانچہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے تو بطور خاص یہ واضح کر دوں کہ ایسے افکار و اشخاص کا ظہور مناسب ماحول اور سازگار حالات کے بغیر محض اتفاقاً ہو جانا ممکن ہی نہیں۔ دوسرے یہ کہ واقعتاً یہ کوئی نادر مظہر نہیں رہا بلکہ علوم کی سب شاخوں کے تعمیری مرحلے میں تسلسل اور کثرت کے ساتھ ان کا ظہور ہوا ہے۔ لیکن تاریخ علوم نے یا تو ان کا احساس نہیں کیا یا پھر تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ اجازت دیجئے کہ اٹھارہ برس پہلے کا ایک واقعہ ' جسے میں بھول نہیں سکتا' اس موقع پر آپ کو سناؤں۔ اتفاق سے میں اپنے جرمن مستشرق ساتھیوں میں سے ایک کی ریڈیائی تقریر البیرونی کے بارے میں سن رہا تھا۔ البیرونی کی مدح و ستائش کے بعد جو ذاتی تبصرہ اس نے پیش کیا وہ یہ تھا کہ ظاہر ہے ہم اسلامی فکر میں تحریک احیائے علوم کے سے علماء کی توقع نہیں رکھ سکتے۔

میں اس رائے پر اپنے دوست کو ہدف ملامت بنانا نہیں چاہتا کیونکہ فکر اسلامی سے ایک عمومی ربط کے باوجود وہ تاریخ علوم کے اس عادلانہ حکم سے محروم تھا جو مشترک فکر انسانی کی تاریخ میں مختلف اطراف سے لئے جانے والے حصے پر لگایا جانا چاہئے۔ اس کے حافظے میں علوم اور تہذیبوں کی وہی مصنوعی تاریخ تھی جسے ہم نے اور اس نے درس گاہوں میں پڑھ رکھا ہے۔

سامعین کرام! آج کے خطبے سے میرا مقصد یہ نہیں کہ میں تاریخ علوم میں مسلمانوں کے مقام پر گفتگو کروں اور نہ مجھے اس بات سے کچھ خوشی ہوتی ہے کہ تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام ان کی اولاد کے لئے محض اظہار فخر کا ایک وسیلہ ہو۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ آج عربی و اسلامی علوم کے وارث ہیں' ان کے لئے ان علوم کی تاریخ کا تحقیقی مطالعہ بسکہ ضروری ہو گیا ہے جس کا ان پر زندگی بخش اثر پڑے گا۔ یہ عمل ناگزیر ہے تاکہ ان وارثوں کو پہلے تو یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے آباء نے علوم کا آغاز کس طرح کیا' وہ کہاں تک پہنچے اور اس سلسلے میں کسی محنت' مستقل مزاجی' سچی بے نیازی اور صبر' اپنے پیشروؤں کے کاموں سے انصاف اور درگزر' ارتقائے علوم کے مسئلے کے واضح فہم' خود اعتمادی' اسرار کائنات کا احاطہ کرنے کے لئے اللہ کی عطا کردہ انسانی صلاحیتوں پر وسیع اعتماد' اور کیسی تنقیدی اخلاقیات سے کام لیا تاکہ رفتگاں کے حالات ان کے لئے عمدہ نمونہ بھی ہوں اور پر اثر اور باثمر طریقے پر سامان عبرت بھی۔ اور پھر ان وارثوں کو اس نفسیاتی گرہ سے بھی نجات ہو جو علوم کے جدید ارتقاء کو دیکھ کر ان میں سے بعض کے ہاں پیدا ہو گئی ہے حالانکہ ان علوم میں ان کے آباء کا حصہ دیگر اقوام سے کسی طرح کم نہیں اس طریقے سے ان کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ اسلامی علوم میں جمود کے مسئلے کا جائزہ ان کی صحیح تاریخ کے مطالعے کی روشنی میں لے سکیں۔

درست ہے کہ تاریخ علوم اس امر میں شک کی گنجائش نہیں چھوڑتی کہ نویں صدی ہجری کے اوائل میں جمود کا مظہر رفتہ رفتہ تمام عالم اسلام میں محسوس کیا جانے لگا۔ جمود کے اسباب متعین کرنے کا مسئلہ بہت مشکل ہے۔ لیکن خود جمود ایک تاریخی حقیقت ہے جو رونما ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوا۔ میرے خیال میں غالباً صحیح طریق کار یہ ہو گا کہ ہم ارتقاء اور جمود کے مرحلوں کا باہمی موازنہ کریں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ کون سے تعمیری عناصر زوال پذیر ہو گئے اور کون سے تخریبی عناصر داخل ہو گئے جو ارتقاء کی رفتار کو گھٹانے کا سبب ثابت ہوئے تاآنکہ اس میں ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس قسم کا موازنہ' سیاسی و اقتصادی تاریخ کی شرکت سمیت عربی و اسلامی علوم کی تاریخ کی ایک گہری وضاحت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک [اس سلسلے میں] ہمارا علم محدود اور عربی و اسلامی علوم کی تاریخ پر جب تک ہمارا مطالعہ غیر ترقی یافتہ ہے' ظاہر ہے کہ ہمارا تجزیہ اندازوں اور مفرضوں کے دائرے میں رہے گا'

اس سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ ایسی صورت حال میں ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کا آغاز کر ڈالیں اور اس ضمن میں حقائق کا سامنا کرنے سے نہ ڈریں خواہ وہ کتنے ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہوں۔

جمود کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے، میرے خیال میں، ایک اہم تمدنی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ عربی و اسلامی علوم چوتھی صدی ہجری کے اواسط سے مغربی دنیا میں منتقل ہونے شروع ہوئے اور یہ اسی وقت ہوا جب انسانی سطح پر ضروری رابطے کے ذریعے وہاں پر فضا سازگار ہو چکی تھی۔ نویں صدی کے اوائل میں بھی مغرب کی مسیحی دنیا کی طرف عربی و اسلامی علوم کے منتقل ہونے کا یہ عمل جاری رہا۔ اس حقیقت کا مفہوم یہ ہے کہ عربی و اسلامی علوم کو اپنے خلاق تعمیری مرحلے کے وسط میں پہنچنے سے قبل ہی، ایک اور نمو کا موقع ملا جس کے نتیجے میں وہ ایک اجنبی ماحول میں ارتقاء پذیر ہونے لگے اور اس نئے ماحول کا دامن اپنے مزید انکشافات سے بھرتے رہے تا آنکہ چند صدیوں کے عرصے میں یہ ماحول خلاق اور تعمیری صورت اختیار کر گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ علوم اس اٹھان اور نئے ماحول میں عربی و اسلامی علوم کے اس تسلسل سے منکر ہو گئی ہے اور اس کا نام "تحریک احیاء کا دور" رکھ دیا ہے اور غالباً انیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے اسے یونانی علوم کے نقش قدم پر مغرب کی مسیحی دنیا کی بیداری قرار دینے کا اور یہ کہنے کا رواج ڈال دیا ہے کہ یونان کا عقلی مسلک ہی وہ مسلک تھا جس نے انسانوں کو قرون وسطی کے اواخر میں اس عقلی قوت پر اعتماد بخشا جو اسے عطا ہوئی تھی۔ اس مصنوعی اور من گھڑت تصور نے جو تاریخی حقائق کی تحریف پر مبنی ہے خود مغربی دنیا میں اعتراضات کو تقویت دینی شروع کر دی ہے۔ اسی چیز نے معاصر فرانسیسی فلسفی اتین جیلسون (Etienne Gilson) کو مجبور کیا کہ وہ ۱۹۵۵ء میں اپنی کتاب میں اس نام نہاد تحریک احیاء کو "جامعات کے اساتذہ کی تحریک احیاء" کا نام دے۔ اس کی رائے میں تحریک احیاء کا مفہوم خالصتاً تاریخی مفروضہ نہیں ہے جس کے درجہ صحت کا تعین و واقعات کے حوالے سے کیا جاتا ہو بلکہ یہ ایک اصولی نقطہ نظر کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی سبب سے بحث کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ واقعات نے یہ اصولی موقف پیدا نہیں کیا بلکہ تحریک احیاء کی یہ تعریف جذبات کی ان گہرائیوں سے پھوٹتی ہے جس سے خود واقعات پیدا کئے جاتے ہیں ۰۰۰" جیلسون یہ بھی کہتا ہے کہ:

"تاریخی حقیقت -- جسے انسان بعید از امکان سمجھتا ہے یا نظرانداز کر دیتا ہے -- کے مقابل ایک اور جعلی، خود ساختہ حقیقت جنم لیتی ہے جسے انسان خود تراشتا ہے۔ پھر وہ اس کی شرح و تاویل جاری رکھتا ہے تاآنکہ باقی تمام حقائق -- جو اسی وہمی بنیاد سے لگا نہیں کھاتے -- کو رد کرنے کے لئے اسی کا سہارا لینے لگتا ہے"۔ (۴)

اس گریز کے بعد میں اپنے بنیادی موضوع کی طرف لوٹتا ہوں اور دوبارہ یہ عرض کرتا ہوں کہ اسلامی دنیا نے اسطریقے پر ایک طرف تو مغرب کی مسیحی دنیا میں علوم کے سفر کو جاری رکھنے کا سامان مہیا کیا جو (ان علوم کے لئے) ایک اجنبی دنیا تھی۔ اور دوسری طرف اس عمل میں بعض اہم سیاسی، دینی، اقتصادی، اور عسکری اسباب کے پہلو بہ پہلو -- ایک اور جہت سے بھی حصہ لیا اور ہماری تہذیب کے جمود و زوال کا سامان کیا۔ یہ درست ہے کہ ہم جمود کے اسباب کو تمام و کمال اسی خارجی سبب پر محمول نہیں کر سکتے۔ بلاشبہ بہت سے داخلی اسباب بھی اس میں شامل تھے۔ مثلاً مسلکی اختلافات، دنیائے اسلام کے مشرق میں منگولوں کی اور مغرب میں بربریوں کی پیدا کی ہوئی شدید بے چینی، صلیبیوں کے لگاتار حملے جنہوں نے معمول کے علمی ارتقاء کے تسلسل پر منفی اثر چھوڑا، علاوہ ازیں علم اور علماء کی سرپرستی کا خاتمہ اور کتابوں کی بربادی، اعلی درسگاہوں اور علماء کے مابین مسلسل تعلق کا ختم ہونا اور اہم دریافتوں کا دنیائے اسلام کے ایک علاقے سے دیگر علاقوں کی طرف منتقل نہ ہونا۔

مثال کے طور پر یہاں میں علم الفلک کے حوالے سے ایک اہم حقیقت کی نشان دہی کرنا چاہوں گا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں مسلمان فلک شناس مشرق میں اپنے جدید نظریات کے ذریعے بطلیموس نظام کے زوال کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ جبکہ مغربی دنیائے اسلام میں ان کے ہم چشم، چھٹی صدی ہجری میں اسی نظام کے خلاف کچھ اور جدید نظریات پیش کر رہے تھے۔ اور ان نظریات کے ایک جانب سے دوسری جانب تک پہنچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تاہم یہ سب جدید نظریات چند ہی سال میں مغربی دنیا تک پہنچ جاتے تھے اور نہ صرف فلکیاتی افکار بلکہ فلسفہ و طبعیات کے افکار کو بھی آگے بڑھاتے تھے۔

یہ بات خاص طور پر نشان دہی کے لائق ہے کہ ان دونوں صدیوں کے دوران یعنی خود

مرحلہ جمود سے فوراً پہلے کے عرصے میں دنیائے اسلام میں بہت سی عظیم الشان دریافتیں ہوئیں جن سے یہ توقع پیدا ہوتی تھی کہ تجربی اور فلسفی علوم کی تقریباً سبھی شاخوں میں فکر انسانی ایک نئے مرحلے سے دوچار ہونے والی ہے۔ تاہم تاریخی حالات ایسے تھے جن کے سبب دنیائے اسلام میں تو یہ [افکار و انکشافات] مقامی سطح تک محدود ہو کر رہ جاتے تھے۔ لیکن بدیسی حلقے کی طرف تیزی سے منتقل کر دیئے جاتے تھے جہاں انہیں ہاتھوں ہاتھ لینے اور عمل میں لانے والے موجود تھے اگرچہ پہلے پہل یہ کام تقلید یا سرقے کی سطح پر ہوتا رہا تاآنکہ آگے چل کر اس نے وہاں اپنے ثمرات پیدا کئے۔

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں یہی صورت حال جاری رہی تاآنکہ عثمانیوں نے آکر عظیم دولت عثمانیہ کی بنیاد رکھی جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہی ہے کہ نویں صدی میں ربع مسکون کے ایک بڑے حصے پر حکمران رہی۔ عثمانیوں کی بارعب عظمت' عالم اسلام کے قویٰ کو آخری بار مرکوز کرنے سے عبارت تھی۔ ایک شاندار ماضی سے ورثے میں ملنے والے ان قویٰ کی ترکیز نے انہیں نویں اور دسویں صدی ہجری میں اس قابل بنایا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی سیاسی و عسکری قوت کی حیثیت سے سامنے آسکیں۔ لیکن انہیں یہ خبر نہ تھی -- بلکہ خبر ہونا ممکن ہی نہ تھا -- کہ یہ عظمت جو ان دو صدیوں میں قائم و دائم رہی ان کے دشمنوں کے لئے ایک ایسے مرحلے کی ابتدا ثابت ہو گی جس میں وہ ان پر سبقت لے جانے اور علم و سیاست کے میدان میں انہیں ان کے مقام سے ہٹا دینے کا آغاز کریں گے۔

یہ درست ہے کہ عثمانیوں نے عربی و اسلامی علوم نیز جامعات کا تصور اپنے مسلمان اسلاف سے ورثے میں پایا اور اس پر توجہ دینے میں غفلت بھی نہیں برتی۔ جہاں تک اس تاریخی حقیقت کا تعلق ہے کہ جو علوم ان تک پہنچے تھے وہ تقریباً ایک صدی قبل جمود اور زوال کے مرحلے میں داخل ہو چکے تھے' سو اس کا عثمانیوں کو احساس نہ تھا اور اس وقت یہ ان کی نظر میں دشوار بھی تھا۔ جبکہ مغرب کی مسیحی دنیا میں ترجیحات علمی کا شعور نیز علم کے میدان میں گہری دلچسپی فروغ پا چکی تھی اور اس صورت حال سے ان لوگوں کی ہمت افزائی ہوئی کہ وہ عربوں کے مقابلے کے لئے اٹھیں اور یہ کیفیت تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر سے واضح ہونے لگی۔ محقق کو جو تاثر ملتا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے اعلیٰ علمی مرتبہ جس تک رسائی کے لئے نویں صدی

ہجری کے بعد سے دنیائے اسلامی کوشاں رہی وہ محض اسلاف کے ورثے کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ کر محفوظ کر لینے سے عبارت تھا۔ اس زمانے سے آگے چلتے ہوئے محقق کو شاذ ہی کہیں اس ورثے کو بنیادی اعتبار سے آگے بڑھانے کی ضرورت کا شعور نظر آتا ہے۔

عثمانیوں کی یہ دو صدیاں تو اسی کام میں لگ گئیں کہ وہ دنیا کے ایک بڑے حصے پر عسکری تسلط قائم رکھ سکیں۔ پھر انہیں عسکری' سیاسی اور اقتصادی تمام پہلوؤں میں کمزوری اور ضعف کا احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے انداز میں بعض اداروں کی تجدید اور ان میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ وضاحت سے یہ سمجھنے پر قادر نہ تھے کہ اس پس ماندگی کا سبب دراصل علمی پس ماندگی اور علماء کے معیار کا انحطاط تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ انہیں علامات تو دکھائی دینے لگیں لیکن حقیقی اسباب تک ان کی نظر نہ پہنچ سکی۔

آخری تین صدیوں میں تجدید یا -- عثمانیوں کے بقول -- تجدد کی کئی کوششیں سامنے آئیں جن میں حقیقی اسباب کے بجائے علامات پر سطحی سی نظر ڈالی گئی اور' ظاہر ہے کہ' یہ اس مسئلے کو نپٹانے کا کوئی مناسب طریق کار نہ تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کوششوں میں سب سے بھرپور اور جرأت مندانہ کوشش وہ تھی جو اس صدی کے نصف اول میں میرے وطن [ترکی] میں اس وقت کی گئی جب مغربی دنیا اور اسلامی دنیا میں جو زبردست فرق ہے وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ تجدید پسند ترکوں کو یہ یقین ہو گیا کہ بیشتر قدیم ورثے کو چھوڑ کر اس کی جگہ جدید بدیسی اقدار کا حصول ضروری ہے۔ آج ان میں بہتوں کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ وہ کسی حقیقی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ہنوز یہ احساس نہیں ہو سکا کہ ان کا تجزیہ غلط تھا اور جس طریقے پر انہوں نے اس مسئلے کو ہاتھ میں لیا اس کے باعث آغاز ہی سے ناکامی مقدر ہو چکی تھی۔

اب جبکہ اس افتاد کا مفہوم زیادہ کھل کر ہمارے سامنے آ چکا ہے جو ہم پر اور دنیائے تمدن میں ہمارے مقام پر پڑی' ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ حقیقت سے آنکھیں چار کریں اور خود اپنے اوپر تنقید سے خوف نہ کھاتے ہوئے' حقیقی اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش کریں ۔ صرف مغربی نظاموں اور اداروں کی تقلید محض کی کوشش سے نہ اب تک مطلوبہ نتیجہ حاصل ہو سکا ہے

نہ آئندہ ہو سکے گا بلکہ ، جیسا کہ میں آغاز کلام میں عرض کر چکا ہوں ' اس کے عین برعکس ' ایسی کوششوں سے بڑی حد تک مایوسی اور ابتری ہی پیدا ہوئی ہے ۔ تاہم جو لوگ ماضی سے پیوستگی کا اصول اپنانا چاہتے ہیں انہیں بھی لازم ہے کہ یہ نہ بھولیں کہ مسلمانوں کے ہاں بہت سے روایتی ڈھانچے قدامت اور پس ماندگی کا شکار ہو چکے ہیں مثلاً مساجد میں وعظوں اور تقریروں کا مواد۔ ان کا سامعین پر کچھ اثر باقی نہیں رہا کیونکہ واعظ یا خطیب علم کے اس اعلی معیار پر فائز نہیں ہے جس کے بل پر وہ مثبت تبدیلی پیدا کر سکے اور ' ماضی کی روایات کے مطابق ' معاشرے کی علمی سطح کو بلند کر سکے ۔

میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ صورت حال صرف ہماری موجودہ صدی پر طاری ہے ۔ تمدنی نقطہ نظر سے عالم اسلام کی گزشتہ چند صدیوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معاشرے کے نقطہ نظر سے ان اسلامی اداروں میں زندگی کی حرارت کئی سو برس پہلے سے ماند پڑنے لگی تھی اور گزشتہ چند صدیوں میں جس مسلمان عالم کی عظمت شان کو تسلیم کیا جاتا تھا وہ درحقیقت اپنے علم کی گہرائی اور گیرائی نیز تازہ کاری کی صلاحیت میں اسلاف کے معیار سے بہت فروتر تھا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ تین سال ہوئے ترکوں نے ابراہیم حقی الارضرومی نامی ایک عالم کا یوم ولادت منایا جس کی وفات دو سو برس قبل ۱۱۸۶ ہجری میں ہوئی تھی ۔ اس سلسلے میں بطور خاص اس کی کتاب "معرفت نامہ" کی زبردست قدر و منزلت کا چرچا ہوا کیونکہ ترکوں کے خیال میں یہ کتاب نہ صرف تمام اسلامی علوم کا خلاصہ پیش کرتی ہے بلکہ اس میں مولف کے دریافت کردہ بعض اہم نکات بھی شامل ہیں ۔ جبکہ درحقیقت اسلامی علوم کی تاریخ پر نظر رکھنے والے کے لئے یہ مشکل نہیں کہ وہ کتاب کے سرسری سے مطالعے کے بعد ہی یہ معلوم کر لے کہ اس میں چند ماخذ -- جن سے مولف کو استفادے کا موقع ملا -- کو یکجا کر دیا گیا ہے نیز یہ کہ مولف کو اندازہ نہ تھا-- اور اس زمانے میں اس کا امکان بھی نہ تھا کہ اسے اس حقیقی معیار کا کچھ اندازہ ہوتا جس تک مختلف علوم میں مسلمان رسائی حاصل کر چکے تھے ۔ اور اس کی اس کتاب میں تازہ کاری نام کی کوئی شے نہ تھی ۔

آخر میں نہایت اختصار کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ اسلامی تہذیب میں جمود کی اگر ہم ایک عمومی توجیہ کریں تو اسے ایک ایسی تاریخی حقیقت تسلیم کرنا ہو گا جو تاریخ میں ہر تہذیب پر وارد ہوئی ہے۔ اسلامی تہذیب سے وابستگان کو' جو مستقبل میں ویسا ہی مقام حاصل کرنا چاہتے ہوں جیسا ماضی میں رہ چکا ہے' لازم ہے کہ جمود کے اسباب کا ٹھیک سراغ لگائیں۔

ورثے میں ملنے والے اداروں کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کریں' اور تقلید محض سے دامن بچاتے ہوئے دور حاضر کی میراث انسانی کے صالح عناصر کو جرأت مندی کے ساتھ اخذ کریں۔ یہ نہایت مشکل کام ہے جو از خود عمل میں نہیں آ سکتا۔ اس کا عمل میں آنا حقیقی معنوں میں منجھے ہوئے ذھن اور نہایت عالی مرتبہ علماء کے وجود پر موقوف ہے۔

وقت آ چکا ہے کہ اسلامی معاشرہ ایسے منجھے ہوئے اذہان اور ایسے علماء کے حصول کی تدبیر کے سلسلے میں اپنی اہم ذمہ داری کو سمجھے۔ یہیں سے معاصر پڑھے لکھے مسلمان کے فرض کا آغاز ہوتا ہے تاکہ معاشرے کے اس بلند مقصد کا حصول ممکن ہو سکے۔ لازم ہے کہ اس ذمہ داری کو اٹھانے والا پڑھا لکھا آدمی مادی طور پر' انانیت کی سطح پر نیز آرام و آسائش کی سطح پر اس قربانی کے لئے تیار ہو جو اس پر عائد ہوتی ہے نیز اپنے حصے کی سچی اور ضروری بے غرضی کو فراموش نہ کرے تاکہ وہ ایک گہرے اور وسیع سائنسی احیاء کی راہ ہموار کرے۔

حوالہ جات

1- Classicisme et declin Culturel dans 1ʻ histoire de 1ʻ Islam. Actes du symposium international dʻ histoire de la Civilisation musulmane (Bordeaux, 25-29, Juin 1956) Paris 1957.

۲- الحسن بن الہیثم کا مقالہ "فی الشکوک علی بطلیموس" طبع قاہرہ' ص ۳ - ۴

۳- ج ۱' ص ۵ اشاعت حیدر آباد' ۱۹۵۴

4- E. GILSON, Heloise und Abelard, Zugleich ein Beitrag Zum Problem vom Mittelalter und Humanismus. Freiburg 1955, S. 98ff.; H. SHIPPERGES, Ideologie und Historiographie des Arabismus, Beiheft Zu Sudhoffs Archin, Wieshaden, 1961, S. 14.

***